پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کا اظہار
(منتخب افسانوں کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ)
Expression of Cultural Identity in Pakistani Urdu Fiction
(Research and Critical Review of Selected Short Stories)

[i] ڈاکٹر اسد محمود خان [ii] ڈاکٹر محمد اشرف

Abstract:

The formative base of language, literature and civilization is a matter of inertia from the source and creator of social identity, where dialect and expression, the reality of literature, while literature is helpful in the formation and exploration of cultural identity. Literature is created out of passion being formed by the internal and inward earnest setting of emotions and affection, which has an encrusted and organized socio-cultural core. The short story is the art of presenting the socio-cultural experiences woven under the emotions and affection, where dialect, expression and civilization are formed and explored. Perhaps, the story kept unravelling the knots of social consciousness on the one hand, while, it kept unravelling the knots of cultural consciousness on the other hand. This is why short story fiction became a subtle means of presenting socio-cultural realities. This research article will be helpful in recuperating the expression of cultural identity presented in selected Pakistani Urdu short stories.

Keywords: *Language, Literature, Civilization, Cultural Identity, Short Story, Expression, Fiction*

زبان و ادب اور تہذیب کی تشکیلی اساس ، معاشرتی تشخص کے منبع و مخرج سے جڑت کا معاملہ ہے جہاں زبان و بیان ، ادب کی حقیقت جب کہ ادب ، تہذیبی تشخص کی تشکیل و تلاش میں معاون و مددگار ہوتا ہے ۔ تخلیق ، داخلی و باطنی کیفیات کے درمیان مچلتے شدتِ احساس سے جنم لیتی ہے جو اپنی تہہ داری اور سلقیہ شعاری میں سماجی و تہذیبی چاشنی رکھتی ہے ۔ کہانی ، انسانی کیفیات میں بُنی سماجی و تہذیبی پیش کاری کی قبول صورتی ہے جہاں زبان و بیان اور روایات کی تشکیل و تلاش ایک کار مداوم ٹھہرتا ہے ۔ کہانی ایک طرف سماجی شعور کی گرہیں کھولنے میں مصروف ہُوئی اور دوسری جانب تہذیبی شعور کی گتھیاں سلجھانے میں مشغول رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ سماجی اور تہذیبی حقیقتوں کی پیش کاری کا ایک لطیف ذریعہ بنتا ہے ۔ مذکورہ تحقیقی مضمون پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریے کی بازیافت میں معاون و مددگار ثابت ہوگا ۔

کلیدی الفاظ: زبان ، ادب ، تہذیب ، ثقافتی شناخت ، معاشرتی تشخص ، تشکیلی اساس ، مختصر کہانی ، افسانہ ۔

(1)

تہذیب کیا ہے اور تہذیب و ادب کا باہمی تعلق کیسا ہے؟

تطہیرِ فکر، ذوق یا آداب؛ معاشرت، ترقی یافتہ اور مودب؛ فکری، ثقافتی اور مادی ترقی ؛ سماجی و معاشرتی تنظیم کاری؛ تمدن، مدنیت، شہر زیستی و شہر نشینی؛ اخلاق، ثقافہ، کادیب و انظباط ؛ یا معاشرہ جس نے خود کی ثقافتی اور تنظیمی شناخت بنالی یا پھر معاشرہ یا ملک جس نے اعلیٰ طرزِ زندگی عبارت بنالی؛ تہذیب ایک

[i] Independent Scholar from Lahore (Corresponding Author)

[ii] اسسٹنٹ پروفیسر(اردو) ، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج آف سائنس ، ملتان ۔

پیچیدہ انسانی معاشرہ ہے جس میں ثقافتی ترقی کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ انسانی سماجی و ثقافتی ترقی اور تنظیم کاری کی اعلیٰ ترین صورت، یا سماجی و ثقافتی ترقی اور تنظیم کاری کا مرحلہ جو اعلیٰ ترین صورت اختیار کرے، تہذیب کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب کو انسانی معاشرے کی وہ کیفیت لکھا جس کی امتیازی خصوصیات میں ذہنی و تکنیکی، تمدنی و معاشرتی ترقی شامل ہو جب کہ تہذیبی ترقی کو مہذب ہونے اور بنانے کا عمل کہا ہے۔[۱]

فیض احمد فیض کے مطابق تہذیب ظاہری و باطنی کیفیات کی تشکیلی صورت ہوتی ہے، جہاں:

> "جمالیاتی تخلیقات، شعوری یا غیر شعوری اجزائے ترکیبی سے جنم لیں اور معاشرتی اقدار کے طور پر رائج ہو جائیں۔"[۲]

ڈاکٹر سید عابد حسین اجتماعی سماجی زندگی کا حاصل تہذیب سے موسوم جانتے ہوئے کہتے ہیں:

> "کسی کا قوم کے اجتماعی ادارات، اصول و قوانین اور زندگی کے جامع نصب العین کو تہذیب سے موسوم کیا جائے گا۔"[۳]

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Eliot) نے تہذیب کو ثقافتی پیمانے پر رکھ کر سماج کی مشترکہ ہم آہنگ کوشش و کاوش کہا:

> "Culture is the product of a variety of more or less harmonious activities, each pursued for its own sake."[4]

تہذیب، عربی زبان سے مشتق جب کہ اسم تفضیل سے مصدر ہو کر اردو میں حاصل مصدر کے طور رائج ہے۔ اردو میں اپنی عربی ساخت اور معانی کے لحاظ سے بعینہٖ داخل ہوا۔ پہلی بار "تذکرہ گلشن ہند" (۱۸۰۱ء) میں مستعمل ہوا۔ بعد ازاں سر سید احمد خان کی "آثار الصنادید" (۱۸۴۶ء) اور مولوی عنایت اللہ کی ترجمہ کتاب "جامع الاخلاق" (۱۸۸۵ء) میں بتدریج رائج کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں "سِولیزیشن" یا "کلچر" کو اردو زبان میں تہذیب، تمدن یا ثقافت کے معانوں میں برتا جاتا ہے۔ البتہ! "سِولیزیشن" اپنے عربی، فارسی اور اردو قالب کے باوجود دنیا کی قریب تئیس زبانوں میں ذرا سے اتار چڑھاو کے ساتھ اِسی لہجے اور معانی میں رائج ہے جن میں "سِول لی زا جیا" (بوسنیا)، "سِول لیز ایس" (چیک)، "سِولیزیشن" (فرنچ)، "زِی ولیزیشن" (جرمن)، "سِول لیٹا" (اٹالین) اور "سِول لیزا شین" (سپینش) شامل ہیں۔

"چارلس گرے" (Charles Gray) نے تہذیب اور ثقافت کی گتھی کھولتے ہوئے لکھا ہے کہ "لفظ کلچر کی وضاحت اس وقت مشکل ہو جاتی ہے جب یہ تہذیب کے ساتھ بہت گہرا وابستہ ہوتا ہے گویا کہ اسے تہذیب کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ جب کلچر کی اصطلاح کو عمومی معنی میں استعمال کیا جائے تو اس میں تہذیب اور ثقافت دونوں شامل ہوتی ہیں۔"[۵] جب کہ تہذیب کا تفہیمی معاملہ سلجھانے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا تھا:

> "کلچر میں نئی قدروں کی عوامی سطح پر قبول صورتی کا عمل تہذیب کا عمل ہے، جہاں کلچر کی سطح، تموج اور جست جب کہ تہذیب کی سطح، پھیلاؤ، جذب اور تقلید ہے۔"[۶]

تہذیب، ادب کا قرینہ اور ادب، تہذیب کا پہلا زینہ ہے۔

در حقیقت ہر قوم ایک تہذیب؛ معاشرہ، تہذیبی سرمایہ اور معاشرت، تہذیب و تمدن کی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ جس کا کشٹ مسافرت، روز افزوں ہو گا وہی قوم متمدن، معاشرہ مہذب اور معاشرت تمدنی تنظیم و ترتیب کا تسلسل ہو گا۔ فردِ واحد کا اخلاق، خیال اور سلیقہ اظہار قومی شناخت کی سمت رہنمائی کرتا ہے جو ایک مشترکہ اقدار کا حامل معاشرہ جنم دیتا اور معاشرت پروان چڑھاتا ہے۔ قوم، معاشرے اور معاشرت کی تہذیبی نمو کے لیے جو قدریں مشترک ہیں، اُن کا براہ راست تعلق انسانی علم و ادب اور شعور و آگہی سے نکلتا ہے۔ برطانوی ادیب "ایلن ولسن واٹس" (Alan Wilson Watts) نے شدتِ جذبات اور تخیلاتی کاوش کا حاصل، خود کی دین نہیں دوسروں کی عطا ہوتا ہے یعنی خیال کا آہنگ اور زبان و بیان کا ڈھنگ دراصل معاشرت اور تہذیب کا حاصل ہے:

> "Our most private thoughts and emotions are not actually our own. We think in terms of languages and images which we did not invent, but which were given to us by our society."[7]

مشہور فرانسیسی مفکر و ادیب "البرٹ کیموس" (Albert Camus) نے تہذیبی بقا کا ذمہ دار ایک ادیب کو کہا تھا:

> "The purpose of a writer is to keep civilization from destroying itself."[8]

امریکن تاریخ دان "باربرا ڈبلیو۔ ٹچ مین" (Barbara W. Tuchman) نے کہا تھا:

"کتابیں تہذیب کی امانتدار ہوتی ہیں، کتابوں کے بغیر تاریخ خاموش، ادب گُنگ، سائنس اپاہج جب کہ فکر و خیال اور گمان ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کتابوں کے بغیر تہذیب کی ترقی ناممکن تھی۔ کتابیں تبدیلی کا محرک ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا، کتابیں دنیا کو دیکھنے کا دریچہ اور وقت کے سمندر میں نصب لائٹ ہاؤس ہیں۔ کتابیں دوست و ہمدم، ساحر و معلم، گنجینہ فکر و دانش ہیں۔ کتابوں کی طباعت دراصل انسانیت کی طباعتی صورت ہوتی ہے۔"[9]

"رالف والڈو ایمرسن" (Ralph Waldo Emerson) نے کتابوں سے جڑت اور حظ کو تہذیب کی اعلیٰ ترین شکل کہا ہے:

"In the highest civilization, the book is still the highest delight. He who has once known its satisfactions is provided with a resource against calamity."[10]

تہذیب و ادب کا باہمی گہرا تعلق تطہیرِ فکر، ذوقِ علم ہنر اور آداب معاشرت ہی تہذیب کی اساس بناتا ہے۔ اخلاق، تخلیق، تخلیق کار اور ترقی یافتہ سماج و ثقافت اور مادی ترقی و معاشرتی تنظیم کاری، تہذیب و تمدن کے اجزائے ترکیبی ترتیب دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تخلیقی اصلاح فکر کی پرورش کرنے والی قومیں مہذب اور معاشرے ترقی یافتہ کہلاتے ہیں جہاں اہل علم و قلم ادیب اور دانش ور ایک پُر فعال تطہیری فکر کی آبیاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

(2)

کیا تہذیبی شعور اور تخلیقی ادب کا باہمی تعلق، تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل میں معاون ہو سکتا ہے؟

تخلیقی ادب، تہذیبی شعور کی بنیاد بنتا ہے جب کہ تہذیب کی مقررہ اور مروجہ اقدار کا اظہاریہ اور اعلامیہ، ادب کا مَرہون مِنّت ہے۔ جس طرح تخلیق، خارجی و داخلی شدتِ کیفیات کا معاملہ ہے ویسے ہی تہذیب بھی خارجی و داخلی شدتِ کیفیات سے جنم لینے والی اقدار کے سنوارنے کا معاملہ ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں "گذشتہ لکھنو" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

"تہذیب ایک ایسا نقش ہے جس کو تہہ نشیں ہونے اور سنورنے کے لیے خاصی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہاں ضابطے بنتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ بے شمار عناصر قدرتی طور سے آمیزش و آویزش کے تہ در تہ عمل سے دوچار رہتے ہیں۔ تب صورتوں کی نمود ہوتی ہے۔ جس طرح اچھی شاعری کو محض صنعت گری راس نہیں آتی، اسی طرح تہذیبی سطح پر بھی ایسی کوشش دیر پا نہیں ہوتیں جن کی مدد سے کوئی طبقہ یا علاقہ یہ چاہے کہ تہذیبی عوامل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیا جائے یا یہ کہ ارتقائے تہذیب یا تشکیل تہذیب کے آہستہ خرام فطری قانون کو تبدیل کر لیا جائے۔ ضد میں سب کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا بھی جاتا ہے، لیکن ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقش، چمک دار تو بن جاتے ہیں، دیر پا نہیں ہوتے اور اُن میں تہہ داری کی بھی کمی ہوتی ہے۔"[۱۱]

فکر و خیال اور شعور کی باہمی جڑت، دراصل تخلیقی ادب اور تہذیبی شعور کی باہمی جڑت ہے۔ دورِ حاضر کے مروجہ نظریاتی ادبی مباحث میں "مارکسیت نظریہ" مادی حالات کے مُداوَمَتِ عَمَل کو تخلیق اور تخلیقی شعور کی اصلیت گردانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد، معاشرہ اور تہذیب کی شعوری لہر کو بھی مادیت کا مُداوَمَتِ عَمَل ہی کہا جائے گا۔ ڈاکٹر جرالڈ وُڈرُف (Gerald L. Woodruff) نے اپنی کتاب "سمپلی گاڈ" میں فکر و خیال اور شعور کو مادی مُداوَمَتِ عَمَل کا حاصل لکھا ہے:

"Mind and consciousness are by products or of material processes."[12]

ویلش سوشل رائٹر "ریمنڈ ولیمز" (Raymond Williams) تہذیبی و ثقافتی مادیت کا نظریہ بیان کرتے ہوئے تخلیق کو مادی ذرائع کا سماجی استعمال کہتا ہے اور ادب کو معاشرتی ترقی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اپنا نظریہ کی وضاحت کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"Culture is a productive process, focusing on arts such as literature."[13]

معاشرہ و معاشرت اور تہذیب و ثقافت کا مرکز و محور ادب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کو اظہاریے کی ایسی صورت قرار دیتے ہیں جو شعور و آگہی کے حصول میں پہلی سیڑھی کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ "ادب ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعور و ادراک حاصل کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخیلی تجربے کو ابھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس

تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب میں متحرک کرنے اور ہماری روح میں موجود خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ "[۱۴] ادب کو تخلیقی سراپا زیست بخشنے والے ادیب بارے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> "ادیب ایک ایسا انسان ہے جس میں ادراک کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور اس کے اظہار کی قوت بھی۔ اس کے ادراک و اظہار میں اتنی داخلی و خارجی وسعت اور تہ داری ہوتی ہے کہ ادب انفرادی و ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے۔ جتنا بڑا ادیب ہوگا اس کے تجربے کا تنوع، اس کا شعور و ادراک اور اس کا اظہار اتنا ہی بڑا اور آفاقی ہوگا۔ "[۱۵]

تخلیقی فکر و شعور کا بدلاؤ، تہذیبی فکر و شعور کا بدلاؤ ہوتا ہے البتہ اول آخر کی ترتیب شدتِ جذبات کی تاثیر کا معاملہ ہو سکتی ہے؛ کہیں تخلیقی فکر و شعور، تہذیب کا وسیلۂ نخستین بنتا ہے اور کہیں تہذیبی فکر و شعور، تخلیقی اظہاریے کا سبب بھی ہو سکتی ہے۔ قوموں اور معاشروں کی تعمیر و ترقی، جن مثلثی زاویوں کے گرد تعبیر سے گزرتی ہے اُن میں پہلی فرد قوم اور معاشرہ جب کہ دوسری ادیب، مہذب اور تہذیب کے زاویوں سے نکلتی ہے؛ ایک تخلیقی اور دوسری تہذیبی مثلث کی کرداری اساس ٹھہرتی ہے۔ تخلیقی فکر و شعور اور تہذیبی فکر و شعور کے باہمی تعلق کی تفہیم کا معاملہ سلجھاتے ہوئے ڈاکٹر طاہر حمید تنولی لکھتے ہیں کہ "معنی و مفہوم کے اعتبار سے تہذیب ثقافت سے زیادہ عموم کی حامل ہے اس کا اطلاق روحانی اور فکری پہلو پر کیا جاتا ہے۔ جبکہ تہذیب معنوی و مادی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے۔ تہذیب انسانی تقدم، سائنسی و دینی علوم ادب اور محققین کی اُن کاوشوں کا مظہر ہے جن کو وہ مختلف زمانوں میں سرانجام دیتے رہے ہیں۔ "[۱۶]

تہذیبی تشکیل میں مجموعی طور پر بہت سے عناصر کارفرما ہیں البتہ چند مشترکہ عناصر کے ذیل میں "مائیکل پیسیون" (Michael Pacione) شہری جغرافیہ کے عالمی تناظر میں لکھتے ہیں:

> "Culture refers to the characteristics that bound a particular group of people, including language, religion, literature, architecture, ethics, music, clothing, cuisine and the art."[17]

تہذیبی شعور اور تخلیقی ادب کے عناصر ترکیبی اور اساسِ تشکیلیہ کے بیان میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"کلچر کے کثیف عناصر معاشرے کی خارجی سطح یعنی اس کے چھلکے پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں طرز بود و باش، رسوم، خوشی، اور غم کی تقاریب، موسم کے ساتھ ہم آہنگی کے مواقع یعنی تہوار، کاروباری زبان، کامرانی یا رد و بلا کے لیے اقدامات، ارد گرد کے ماحول سے اخذ و اکتساب، کار جہاں اور اس قسم کی دوسری لاتعداد صفات شامل ہیں۔"[۱۸]

ڈاکٹر وزیر آغا تہذیبی تشکیل کی حتمی صورت یوں بیان کرتے ہیں:

"جس معاشرے میں کلچر کے اجزائے ترکیبی یعنی اجزائے کثیف موجود ہوں وہ کچھ عرصے کے بعد ثقافتی اعتبار سے فعال ہو جاتا ہے اور اس کے فنون لطیفہ میں معاشرے کی وہ روح سمٹ آتی ہے جسے اس معاشرے کے کلچر کا بہترین ثمر قرار دینا چاہیے۔"[۱۹]

تہذیبی شعور اور تخلیقی ادب کے ترکیبی اور تشکیلی عناصر کی گتھی سلجھانے کے بعد تخلیقی فکر و شعور اور تہذیبی فکر و شعور کے باہمی تعلق کا تفہیمی سلجھاؤ پیش کرنے میں سہولت در آتی ہے جو ادیب کی فعالیت اور ادب کی تکملیت پر تہذیب کی تشکیلیت کا مقدمہ رو برو کرتی ہے۔ مٹی کی جڑت، گردِ خاک سے محبت اور گرد و پیش سے وابستگی کا احساس، خیال کی جست، لفظوں کی بُنت اور اظہار کی قوت ودِیعت کرتا ہے جو تہذیب کا خمیر اٹھاتی ہے۔ ہر حال اپنی مٹی میں رہ کر گرد خواب پر تعبیر کی منزل، تہذیب کی منزل ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ، تخلیقی فکر و شعور کی وہ عملی صورتیں ہیں جو تہذیبی فکر و شعور کے سجنے سنورنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں جو صوتی تاثیر و آہنگ کا باہمی ربط، داخل پذیری اور اثر انگیزی براہ راست موسیقی شاعری اور فقیری پھیروں کی تعلق دار کو نشتِ سخن کی مسند نشینی پیش کرتی ہے۔ صوت و آہنگ سے وابستگی، مٹی سے جڑت اور فطرت سے وابستگی کا اظہار یہ بھی ہے۔ نالہ بلبل، سرگوشی گل، دریاوں کا سنگم، جھرنوں کا ترنم، ہواوں کا سرگم مٹی سے جڑت سے کشید ہوتے ہیں جب کہ شعر و شاعری، نظم و غزل اور رقص و موسیقی فطرت سے وابستگی کا اظہار یہ کی صورت ہیں۔ "ہومر" کی ایلیڈ اور اوڈیسی؛ "ولیم شیکسپیئر" کی رومیو جیولٹ اور ہیملٹ؛ "سلویا پلاتھ" کی لیڈی لزرس اور پاگل لڑکی کا گیت؛ "ایلن پوئے" راون اور سمندر میں شہر؛ "رودکی" کی رباعیات؛ ""رومی"" کی مثنوی؛ "فردوسی" کا شاہنامہ "منصور" کا نعرہ اناالحق؛ "اوس بن حجر" کا قصیدہ لامیہ؛ "حسان بن ثابت" کی نعت؛ خواجہ فرید" کی کافیاں؛ "باہو" کی ابیات؛ "خسرو" کی

غزلیات؛ "تان سین" کے راگ و آلاپ نے اپنے اپنے زمانوں اور اپنی اپنی تہذیبوں کو دوام بخشنے کا سامان کیا ہے۔ دیگر معاملات فنون لطیفہ میں رنگسازی، مجسمہ سازی، فن تعمیرات، خطاطی، آلات موسیقی، سائنس، جیومیٹری اور زبان و بیان کی ترویج کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو زمانوں کی کروٹ میں تہذیبوں کا پھیلاؤ لیے ہوئے ہے۔

یہ بات بھی تاریخی طاقچوں میں محفوظ پڑی ہے کہ جب بھی فرد، قوم، معاشرہ، معاشرت یا تہذیب کی قدروں پر قدغن لگانے کی سعی ہوئی علم وادب سے وابستہ افراد نے فکر و شعور کی طاقت کو برملا استعمال کیا بلکہ موثر استعمال کیا ہے۔ پیش نظر عنوان اردو افسانہ میں تہذیبی تشکیل کی تلاش کا معاملہ ہے لہٰذا فکری اور شعوری روانی کی سمت یہی بنے گی۔ یوں بھی پریم چند نے کہا تھا:

> "تاریخ میں سب جھوٹ ہوتا ہے، سوائے نام کے اور افسانہ میں سب سچ ہوتا ہے سوائے نام کے۔"[۲۰]

کہانی کا تعلق کہانی کار اور سماج سے ایسا ہے کہ دونوں کو الگ دیکھنا اندھیرے میں راہ ڈھونڈنے جیسا ہے۔ ڈاکٹر فضل اللہ مکرم، مضمون "اردو افسانہ اور تہذیبی روایتیں" میں رقم طراز ہیں:

> "افسانہ یا کہانی کی بنیاد قصّہ ہے اور ہر قصّہ میں کو نہ کوئی کردار ہوتا ہے اور ہر کردار اپنے دور یا علاقہ یا زبان یا مذہب کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانہ کا بنیادی موضوع انسان ہے اور انسان سے جڑی ہوئی ایک ایک شئے اس کے لوازمات ہیں اس لیے افسانہ سماجی حقیقتوں کو بہتر طور پر پیش کرتا ہے۔"[۲۱]

پروفیسر قمر رئیس "تلاش و توازن" کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

> "ادب سماج کی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہے اور کم از کم زبان کے واسطے سے ادب کی تخلیق ایک سماجی فعل ہے۔ ہر ادبی تخلیق خواہ وہ کسی بھی باطنی تجربے یا داخلی حقیقت کا اظہار ہو، اس کا پیرایہ بیان کتنا ہی نازک اور تہہ دار ہو کسی نہ کسی سماجی صورت حال کا عکس ہوتی ہے۔"[۲۲]

تمہیدی مباحثہ میں نہ صرف تہذیبی شعور اور تخلیقی ادب کا باہمی تعلق اپنی زندہ حقیقت کے

ساتھ مل جاتا ہے بلکہ تاثیرِ زیست کے کئی عنوانات کی تفہیم و تشریح کا معاملہ بھی نبڑ جاتا ہے۔ دوسری جانب تخلیقی فکر و شعور، تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل کا معاملہ سلجھانے میں بھی اپنا تحقیقی و تعمیری کردار نبھانے میں پیش مورچہ دکھائی دیتا ہے۔ تہذیب کی چار دیواری میں علم و ہنر کی پرورش کا اہتمام بطریق احسن موجود ہے جہاں ادیب سانس لیتا اور ادب پنپتا ہے۔ گویا تہذیب، تخلیق کے بغیر ادھوری دکھائی دیتی ہے کہ دونوں کی تعبیریں و تعمیری اساس معاشرہ اور سماج بنتا ہے۔

(3)

کہانی کا افسانوی پیرہن اور پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریہ کی صورت کیسی ہے؟

تخلیقی ادب اور تہذیبی شعور کی باہمی تعلق داری میں عقیدہ، دین، دھرم، مسلک اور آئین؛ ملکی نظم و نسق اور تدبیر؛ باہمی میل جول، ماحول، اقدار، رہن سہن اور طرزِ زندگی سب سماج سے تاثیر لیتا ہے اور سب سماج ایک ادب سے ساری تاثیر سمیٹتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جس طرح سماج مسلسل اور بہتر تبدیلیوں کے اثر میں رہتا ہے، ویسے ہی تخلیق اور ادب بھی مسلسل اور بہتر موضوعات کی تاثیر بانٹتے رہتے ہیں۔ یہاں تبدیلی کی تاثیر کا حاصل تخلیق و تہذیب کا حاصل کہا جائے گا۔ پاکستان میں اردو افسانے کی مسافت کچھ اتنی زیادہ نہیں، لیکن اِس کی مسافرت کا کشٹ مقابل کی فضا میں مقام کہیں آگے کا دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک پاکستانی اردو افسانے کی مسافت و منزل کے بارے یوں اظہار کرتے ہیں:

> "قیام پاکستان کے ساتھ ہی افسانہ نگاری (مختصر افسانہ اور ناول) کی اس روایت کا طلسم ٹوٹ گیا جو سن ستاون کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ نقادوں سے پوچھتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ اردو افسانہ نگاری انگریز راج کی من جملہ برکات میں سے ایک ہے۔ اب مجھ سے پوچھا ہے تو سن لیجیے کہ اردو افسانہ تو سن ستاون کے ہنگامۂ دار و گیر میں کھو گیا تھا۔"[۲۳]

پاکستانی اردو افسانے نے خطِ تقسیم سے اپنی جس راہ کا تعین کیا، اُس پر منزل کا مستقر، منزل کی سمت اور مقام کے تعین کا فیصلہ سناتی ہے اور اردو ادب کو ایک منفرد و کامیاب کوشش و کاوش پر یقیناً فخر کا

معاملہ ہی ٹھہرتا ہے۔ ماہ و سال کی تبدیلیوں نے فکر و شعور کی تبدیلیوں کا قضیہ نبیڑنے کا سامان بھی کیا ہے۔ عالمی منظر نامے میں جنم لینے والی کہانیوں کی گتھی پاکستانی اردو افسانے کے کرداروں کے ہاتھ بھی ہے جو سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور تہذیبی پہلوؤں کے گرد خود کو مضبوط کرتی ہے۔ پاکستانی اردو افسانے نے مسافرت میں جو مستقر دیکھے اُن میں بٹوارا اور فسادات پہلی منزل بنا۔ ہجرت اور منتقلی کا بوجھ اٹھائے کہانیاں اور کردار خیموں سے نکل کر گلی محلوں اور چوباروں میں داخل ہوئے تو دوسرا دور آ چکا تھا۔ فوجی حکومت کے پہلے دور نے معاشرتی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کا جو منظر دیکھا وہ پاکستانی افسانے میں تجریدی اور علامتی کہانیوں کا دور لے کر آیا۔ پہلی بڑی جنگ نے پاکستانی ادب میں وطنیت کی فضا بنائی جب کی دوسری جنگ نے ایک نئی تقسیم کا دکھ کہانیوں میں بانٹ دیا۔ جنگ کے بادل چھٹے تو نئے تجربات، مشاہدات اور تخلیقات نے انگڑائی لی اور کہانی کا پھلنے پھولنے کے لیے ایک اور کامیاب دور دیا، البتہ دہشت گردی کی عالمی تاثیر نے ایک الگ ماحول اور فضا کی کہانی اور کردار، پاکستانی اردو افسانے میں پیدا کی جس کی تاثیر ہنوز موجود ہے۔ کہانی کا افسانوی پیرہن، پاکستانی اردو افسانے کے سندر تا جوبن کا سراپا بنانے اور سنبھالنے میں کامیاب دکھائی دیتا ہے جہاں تخلیقی فکر و شعور اور تہذیبی فکر و شعور کی باہمی جڑت میں تہذیبی تشخص کا اظہاریہ کی صورت برتی ہے۔ تحقیقاتی مضمون میں الفاظ کی گنجائش اور مقالے کی ضرورت کے پیش نظر منتخب افسانوں میں پاکستانی تہذیبی تشکیل اور اظہاریہ کی تلاش کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پاکستانی اردو افسانے کے سرخیل سعادت حسن منٹو، اگرچہ خود کو حقیقت نگاری کے لبادہ میں کروٹ لیتی جنسیت کی چھاپ سے جدا نہیں کر پاتے ہیں لیکن ایک حقیقی تخلیق کار اور کہانی کار کا تہذیبی شعور اپنی تہہ داری کئی افسانوں میں بے نقاب کرتا اور پہلی تاثیر مقابل آ جاتا ہے۔ "ساڑھے تین آنے" میں کریم ملی کافی کی پیالی؛ "آخری سلیوٹ" میں دریائے کشن گنگا کنارے موجود مظفر آباد کو جاتی سڑک پر گندی گندی گالیوں کی گونج؛ "پیرن" کی شلوار قمیص، چست پاجامے، ساڑھی، فراک، بیڈنگ کاسٹیوم اور فینسی ڈریس میں موجود تصویریں؛ "سرکنڈوں کے پیچھے" ڈنڈ پیلتا، مگدر گھماتا، نہ سگریٹ، نہ شراب، اچھے ہندوستانی کھانوں کا شوقین "بلونت سنگھ مجیٹھیا" کا نیل کٹر سے ناخن کی نوک پلک سنوارنا؛ "آنکھیں" کی اندھیری رات میں چمکتی موٹر کار کی ہیڈ لائٹس، ہسپتال کا کیوڑوالٹی اور ایکس رے ڈیپارٹمنٹ، سکریننگ میں صحت

مند چھاتیاں اور دھڑکتا ہوا دل؛ دوسری جانب "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں پاکستان زندہ باد کی گونج اور مٹی سے محبت کی کہانی دراصل منٹو کی وطن سے محبت اور مٹی سے عقیدت کی کہانی ہے جہاں تہذیبی شعور کی لہریں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں۔

''نیا قانون'' کا منگو کوچوان ایک عہد تانگے پر لے کر نکلتا ہے جہاں ایک مکمل تہذیب کی تبدیلی کی خواہش اور تعبیر کا منظر نامہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم افسانے کی تہذیبی تفہیم بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "نیا قانون، موضوع، ماحول، جزئیات نگاری اور فکری بصیرت کے باعث ایک لازوال افسانہ ہے۔ اتنا ہی نہیں، نیا قانون اس زمانے کی سیاسی جد و جہد عوام کی معصومیت، مظلومیت اور محرومیت کا ترجمان ہے۔ اردو ادب میں منگو کوچوان ہمیشہ زندہ رہے گا۔"[۲۴]

اسی ضمن میں ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں:

> "یہ (افسانہ) ہماری سیاسی جد و جہد کے دور کا آئینہ ہے جس میں ہماری آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں اور فنی معیار سے بھی ایک کامیاب افسانہ ہے۔"[۲۵]

غلام عباس نے کم لکھا لیکن جو لکھا وہ زیادہ سے بہتر لکھا، اُن کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع، سیاسی آگہی، معاشرتی جڑت اور تہذیبی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ "اوور کوٹ" کا خوش پوش نوجوان، تراش خراش سے فیشن ایبل، لمبی ابل قلمیں، چمکتے بال، باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی، بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ جس کے کاج میں اٹکا شربتی رنگ گلاب کا ایک اَدھ کھلا پھول، سر پر ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی سبز فلیٹ ہیٹ، گلے کے گرد لپٹا ہوا سفید سلک کا گلوبند، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی جسے کبھی کبھی مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا؛ "کتبہ" میں دفتروں سے نکلنے والے کلرکوں کی ٹولیوں میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر

گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے، ممکن ہے گھر کی یک سوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔ "بہروپیا" میں سماج کے بھید اور روپ جو تہذیب کی چوکھٹ پر دستک دیے، کبھی خاکی کوٹ پتلون پہنے، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، کبھی جٹا دھاری سادھو، لنگوٹ کسا، جسم پر بھبوت رمائی، ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، کبھی سرخ لہنگا پہنے لڑتی، بھڑتی بکتی جھکتی جھنگن؛ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں دکان کی پیشانی پر بہت جلی حروف میں چمکتا "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" جہاں تخلیقی رموز کی گرہیں کھولتا ہے وہاں معاشرت اور تہذیب و تمدن کا گنجلک بھی سنوارتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں موجود سیاسی و معاشرتی شعور نے جس تخلیقی و تہذیبی بلندی کو چھُوا، اُس بارے ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

> "اُن کے افسانوں میں زبان و بیان یا فکر و خیال کی سطحیت کی منزل اور کسی دور میں بھی ہونے نہیں پائی جو تخلیق کو اپنے منصب سے نیچے لے آتی۔"[۲۶]

"آنندی" میں تخلیقی و تہذیبی شعور کی رو کا ایک انداز ملاحظہ ہو:

> "ہمارے نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور ان کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا انہی کے سر بندھے گا۔"[۲۷]

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہی معاشرت پھلتی پھولتی ملتی ہے جو تخلیقی آنچ پر سماج، ثقافت، تہذیب اور تمدن کی سمت متعین کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ "کپاس کا پھول" میں گونجنے والی سریلی اذان اور واہگرو کی قسم، تہذیب کی تاکڑی میں رکھی مذہب اور مہذب بازگشت؛ "الحمد اللہ" ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، اودے رنگ کی مخملی واسکٹ کی ایک جیب میں قطب نما اور دوسری جیب میں نسوار کی نرسئی ڈبیہ، شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہ بند کی جگہ گلابی

رنگ کی سبز دھاری والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں میں پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تھا تو دوسری جیب میں نسوار کی نرسئ ڈبیہ ہوتی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی اور کلاہ کی مطلّا چوٹی، ہاتھ میں گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکوں والا عصا، بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ "گنڈاسا" کا پڑ گوڈی، تیل ملے جثّے اور ڈھول کی تال، رنگین لنگوٹیں، سفید پھین ٹھئے، گپوں اور حقوں کے دور، ماضی اور مستقبل کی جانچ پرکھ کا سامان کیے ہوئے ہے۔ "عالاں" کی ہنر مندی، "ممتا" کی گود میں رکھی دنیا کی تہذیب، "بابا نور" کا مسجد کی محراب کے پاس رک کر جوتے اتارنا اور ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب کو ہونٹوں سے چوم کر باری باری دونوں آنکھوں سے لگانا ایک تہذیبی ورثے کی علامت ہے۔

"پرمیشر سنگھ" تہذیبوں کی باہمی جڑت میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے:

> "مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمھارے خدا کی قسم میں تمھارا دوست ہوں، تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمھیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمھاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمھیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ پھر وہاں اگر تمھیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتار انام کا تو تم اسے ادھر گاؤں میں چھوڑ جانا۔"[۲۸]

ڈاکٹر انوار احمد افسانہ "پرمیشر سنگھ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۷ء کے فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں اگر تین موثر ترین اور فنی اعتبار سے کامیاب افسانے منتخب کیے جائیں تو پرمیشر سنگھ ان میں سے ایک افسانہ ہوگا۔"[۲۹]

انتظار حسین کی افسانہ نگاری نے علامتی افسانے کو ایک نئی منزل بخشی جہاں انہوں نے تخلیقی فکر و شعور کا ہاتھ پکڑ کر تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی فکر و شعور کی منزل ڈھونڈنے میں کامیاب کوشش کی ہے۔ "زرد کتا"، لومڑی کا بچہ اور کبوتر؛ وضو، قلمدان اور کاغذ، روح اور تہذیب کی تفہیم و تفسیر کا معاملہ ہے؛ "ہمسفر" مسافرت میں لاہور، داتا دربار و رپاکستان؛ "شہر افسوس" میں زندہ رہا اور زندہ ہوں کی تکرار، زندگی اور تہذیب کی خواہش جیسی ہے۔ انتظار حسین کا "آخری آدمی" ہنوز تہذیبوں کی تشکیل و تلاش میں سرگرداں افسانوں کی زمینوں میں محوِ سفر ہے۔ عقیل عباس جعفری، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ

"انتظار حسین، ہندوستانی تہذیب کا نوحہ خواں جو یادوں کی بوریاں اٹھائے پاکستان آیا تھا۔" ڈاکٹر فرید حسینی، "انتظار حسین کے افسانوں میں علامت نگاری" کے حوالے سے تہذیبی و تمدنی روایت کا حوالہ یوں ڈھونڈتے ہیں:

> "تہذیب کے خال و خد نکھارنے اور ابھارنے میں انتظار حسین نے جہاں انسانوں، پرندوں، جانوروں اور درختوں کو وسیلہ بنایا وہیں درو دیوار، گلی کوچے، دریچے و دروازے، کنگرے اور صحن بھی درخورِ اعتنا سمجھے گئے۔"[۳۰]

ڈاکٹر نگہت ریحانہ خاں رقم طراز ہیں:

> "قدیم اسلامی تاریخ کے حوالے، دیومالائی دور کے قصے، کہانیاں، حکایات، لوک کتھائیں، یہ سب اُن کے افسانوں میں علامت کے طور پر استعمال ہوئیں۔ گویا ماضی کی بازیافت کے لیے انھوں نے مغربی تکنیک کا سہارا لیا اور اس آئینہ جہاں موجودہ عہد کے بعض ایسے مسائل کو پیش کیا جو اُنھیں بے چین رکھتے ہیں۔"[۳۱]

بانو قدسیہ، کی افسانہ نگاری میں معاشرت کا پہلو، اُن کی تخلیقی و تہذیبی فکر و شعور کی عملی تربیت کا مظہر ٹھہرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے زبان و بیان، کہانی اور کہانی کاری، افسانہ اور افسانہ نگاری کی ترویج کے ساتھ سماج، معاشرہ، رشتے، روایات اور تہذیب و تمدن کی ترویج کا بھی اہتمام کیا ہے۔ "توبہ شکن" کی توبہ اور تھپڑوں کی گونج؛ "یہ رشتہ و پیوند" میں جاری اردو کی کلاس اور دیوانِ غالب پر رکھی انگشتِ شہادت؛ "ذات کا محاسبہ" میں تہذیبوں کی تفہیم کے درمیان جاگتی مٹی، دھرتی اور وطن کی محبت۔۔۔ پاکستان؛ "انتر ہوت اداسی" میں کتی اور گشتی کی چیخ نے گلی محلے میں جنمی روایات کا دَر وَا کیا ہے۔

"نیو ورلڈ آرڈر" میں لفظوں کی ترتیب و تقسیم کی تہذیب توجہ طلب ٹھہرتی ہے:

> "ہاں بھئی ہاں! یاد آیا۔ اس کا ایکسپوژر ضرور ہو۔ کنویں کا مینڈک نہ ہو اپنے ہی گن گانے والا۔۔۔ بلکہ اگر ہو سکے تو انٹر نیشنل لیول کا ایکسپوژر ہو۔ بھلا ایسے آدمی کا بھی کیا فائدہ جو کراس کلچر نہ جانتا ہو۔"[۳۲]

ڈاکٹر ارشاد شفق، "بانو قدسیہ کا افسانوی اسلوب" میں کہانی اور کہانی کار کی سماج اور معاشرہ سے

جڑت کو یوں لکھتے ہیں:

"بانو قدسیہ نے الفاظ کا ذخیرہ سماج اور معاشرے کی کوکھ سے اخذ کیا ہے اس لیے ان کا ہر افسانہ عصری ماحول کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات' جذبات واحساسات کی وضاحت کے لئے بیان کا جو سحر طاری کیا ہے اس میں قاری ڈوبتا چلا جاتا ہے۔"[۳۳]

سید زبیر شاہ، کے افسانے ارضیت اور مقامیت کی بحث سے آگے کا معاملہ ہے جہاں تخلیقی فکر و شعور، تہذیبی فکر و شعور کا ماتھا چومنے آتا ہے۔ یوں بھی مقامیت کا شعور، اجتماعیت کا رنگ نکالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے۔ سید زبیر شاہ کا افسانہ، مقامی روایات کی انگلی پکڑ کر تہذیب و تمدن کی سمت سفر آغاز کرتا اور ایک عالمی منظر نامے کی کہانی سے جڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ "فصیلِ شب کے پار" شام کے سناٹوں میں گم شاداب خیل قبیلہ کی روایات، اسلحہ سے لیس بوڑھے اور تجدید عہد کی روشنی میں جاگتے زرک خیل قبیلہ کی خواہشات؛ "ہائبر نیشن" میں ہوئی پانچویں واردات مخالف احتجاج میں شامل ایک کہانی کار؛ "سرد صحرا کی پیاس" میں گم رشتوں کا احساس اور پیار؛ "ہجومِ مرگ میں زندگی" اور گولیوں کی ٹرتڑاہٹ، سورج کے گلے میں پڑا، ستاروں کی زنجیر کا پھندا؛ "کفارہ" میں مٹی کی محبت کا احساس، وطنیت اور تہذیب کو گرہیں کھولتے دکھائی دیتی ہیں۔

خالد سہیل ملک، سید زبیر شاہ کے افسانوں کو معاشرے سے جڑی کہانی کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زبیر کا افسانہ ہمارے سماج کی کہانی ہے، وہ کہانی جو ہماری دیہی اور شہری زندگیوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔"[۳۴]

یوسف عزیز زاہد لکھتے ہیں:

"اِن افسانوں کے موضوعات میں انسانیت کی تذلیل، انسان کا احساس محرومی، غربت، بھوک اور افلاس سے دوچار عوام کی حالتِ زار، انسانوں کا استحصال، حکمرانوں کی عیاشیاں اور قوم کی بے حسی، عالمی طاقتوں کی چیرہ دستیاں اور غریب ممالک کا استعمار کے ہاتھوں اور قوموں کا معاشی اور معاشرتی انحطاط شامل ہے۔"[۳۵]

"قربانی جو رائیگاں گئی" میں ہمارے معاشرتی روایات کا حسن، خاندانی رشتے اور محبت کا اظہار کچھ یوں سماج کا معاملہ سلجھاتا ہے:

> "وہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بناتی رہی اور اجمل شاہ دور سے دوڑتا ہوا آتا اور گرا دیتا۔ ایک بار جب اُس نے بہن کی گڑیا اٹھا کر تندور میں پھینکی تو وہ رونے لگی، مگر جب ماں نے اجمل شاہ کو ڈانٹتے ہوئے اُسے مارنے کے لیے قدم بڑھائے تو وہ خود اسے لے کر گھر سے باہر بھاگ گئی، پھر جب یہ بڑے ہوئے تو اسی بھائی کی زندگی بچانے کی خاطر، وہ خود کو موت کے ریلے میں بہانے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی۔"[۳۶]

رابعہ الربا، کی افسانہ نگار عہدِ حاضر کی تخلیقی، تہذیبی، سیاسی، نفسیاتی ضروریات کی تاثیر کا حاصل لگتی ہیں جہاں تازہ کہانی اپنے خدوخال کو سنوارنے کے لیے نئے کرداروں اور نئی ضرورتوں کو پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ رابعہ کی کہانیوں میں تخلیقی فکر و شعور کی جست، زمانوں اور زمینوں کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ "ساتویں سمت" روح کی تلاش اور تہجد کا تارا، کہانی کا سفر، کہانی کار کی مسافرت، ایک سات سمندر پار کی شہرت، ایک فسانہ، ایک ناول شیڈوز برنٹ؛ "روح کا سفر" کھوجتی تخلیقی فکر و شعور کی تاریں، آسمانی پردوں پر رائل بلیو لہریں؛ غزل کا مطلع، انا الحق کا نعرہ؛ کعبہ کا طواف، مدینہ کی زمین ایک تہذیب کا سفر کھولتی دکھائی دیتی ہے۔ "دستخط" سے نکلی عورت کی عزت اور محبت کا معاملہ، زمینداروں کی مذہبی روایات کا سلسلہ؛ عالیشان ہوٹل میں بجتی دھیمی موسیقی اور خوابی روشنیوں کا طلسم معاشرت کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں ہے۔ ڈاکٹر سلمیٰ اسلم، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی بازیافت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "تہذیب میں تصویر و رنگ نمودار ہوتا ہے۔ کوئی بھی تہذیب دراصل انسان کی ذہنی، سماجی، مادی، اخلاقی اور روحانی کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔ کسی بھی تہذیب کا اندازہ لگانے کے لئے اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی روایات، مذہب، زبان، خیالات، قانون اور رسم و رواج کو دیکھا جاتا ہے۔ ادیب کے لب و لہجے میں تہذیب و ثقافت اور تاریخ کی مٹھاس پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ قاری کی دلچسپی کو دو بالا کرتا ہے۔"[۳۷]

رابعہ کا افسانہ "کاموفلیگ" میں معاشرتی روایات میں گوندھی تہذیب و تمدن کی گرہیں کھلتی ہیں اور کھلتی جاتی ہیں:

"ہمارا خاندان مشترکہ خاندانی نظام کا ایک حصہ تھا اور چاندنی راتوں میں باتیں داستانوں کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک چاندنی رات کو سارا گھرانا چھت پر اکٹھا تھا۔ سب بڑے بوڑھے ایک طرف اپنا گروہ بنائے چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور ماضی کو یاد کر رہے تھے اور دوسری طرف ماموں ہم سب کزنز کو لے کر کہاوتوں اور حکایتوں سے نواز رہے تھے۔"[۳۸]

دوسری جانب "رات کی رانی" کی کہانی، تخلیقی فکر و شعور کی لہر پر اوپر اٹھتی تہذیب کی کہانی ہی تو ہے:

"اس باغ میں دھنک رنگی گل و گلزار و اشجار ہی نہ تھا، یہاں چاندنی راتوں میں صاحب ذوق بسیرا بھی تھا، وہ ادبی محفلیں سجا کرتی تھیں کہ جن کا ملک بھر سے باہر بھی شہرہ تھا، یوں اس کے ننھے تاروں کے سامنے سائنس و فلسفہ کا ٹکراؤ ہوتا تو کبھی ادب کی بلندیوں و پستیوں کے فلسفے ہوتے، کبھی آرٹ و فن ٹکراتے، کبھی دانش وروں کی باتیں ہوتیں، تو کبھی تہذیب و مذہب کے قصے ہوتے، یہاں راتوں کے تارے بھی خود کو چاند سمجھتے، گرم دنوں کی چاند راتوں میں محفل جوبن پہ ہوتی۔"[۳۹]

کہانی، سماج کے خمیر سے جنم لیتی، روایات کی انگلی پکڑ کر تخلیقی فکر و شعور کی زمینوں پر چلتی اور سیاسی، معاشی اور نفسیاتی نقشینِ تربیت پر آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہر قوم کی تہذیب ہے۔ کہانی کا افسانوی پیرہن اور پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریہ کی صورت نئی منزلوں کی سمت سفر کا معاملہ ہے جہاں پاکستانی افسانہ نگار، اپنے کرداروں کی انگلی پکڑے تہذیبی فکر و شعور کی جانب سفر میں ہیں۔

(4)

تہذیبی شعور، تخلیقی ادب اور تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل کا حاصل کیا ہے؟

کسی بھی معاشرت میں مٹی سے محبت، باہمی وابستگی، تعلق و رشتہ داری کی گوندھی بندھی معراج کیف کو تہذیب کہا جائے گا۔ باہمی جڑت کی خوبی، افراد اور فکر و شعور کی قربت داری کا سبب ٹھہرتی ہے جہاں رسوم جنم لیتی اور روایات پھلتی پھولتی ہیں۔ موجودہ صدی، زمینی و زمانی، علاقائی و مذہبی، تقریری و تحریری، تہذیبی و تمدنی ضرورت سے نکل کر عالمی و مجموعی، سیاسی و معاشی، علمی و فکری تعلق داری

کی جانب سفر بڑھا چکی ہے جس کی سبب تخلیقی فکر و شعور اور تہذیبی فکر و شعور میں کئی نئی صورتیں جنم لے چکی اور کئی نئے مباحث نے جگہ بنالی ہے۔ تہذیبی مباحث کی تازہ کاری نے عالمی تہذیبی ورثہ کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں اور نہ ہی اردو زبان و بیان کی جنم بھومی پر اثرات سے اجتناب ممکن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن مباحث نے جہاں "یک ثقافتی" یا "کثیر ثقافتی" جیسے عنوانات کو متعارف کرایا وہاں "شناخت کے بحران" جیسے موضوع کو زیرِ بحث بھی بنایا ہے۔

ابراہیم اعظمی، مضمون "فیض احمد فیض کی نظر میں کلچر کیا ہے" میں رقم طراز ہیں:

> "ہر قوم کی تہذیب کے تین پہلو ہوتے ہیں: ایک اُس قوم کے اقدار، احساسات اور عقائد جن پر وہ یقین رکھتی ہے، دوسرے اُس کے رہن سہن کے طریقے، آداب اور اخلاقِ ظاہری، تیسرے اُس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"[۴۰]

تہذیبی تشخص کے مروجہ عملی نظریات میں فعالیاتی نظریہ، تضادیاتی نظریہ اور علامتی نظریہ کے درمیان پھوٹنے والی نئی بحث اور تازہ نظریہ "کلچرل ریلیٹوزم" (Cultural Relativism)، تہذیبی اضافیت، تہذیبی علاقیت یا تہذیبی نسبیت کا نظریہ فعال اور اثر پذیر ہوا ہے۔ ایک فلسفیانہ اندازِ فکر و شعور ہے جس کے مطابق سیاست، معیشت، اخلاق، اقدار، قانون اور حقوق، انفرادی یا اجتماعی کسی بھی مقابل سے برتر یا بدتر نہیں بلکہ مساوی اور برابر ہیں۔ انفرادی شناخت، اجتماعی شناخت کا جزو تو ہو سکتی ہے لیکن کُل کے زیرِ اثر خود کا وجود نہیں کھو سکتی ہے۔ انگریزی لٹریچر کی ایک تعریف کا بیان پیش ہے:

> "Cultural relativism is the principle that an individual's beliefs and activities should be understood by others in terms of that individual's own culture."[41]

ایک دوسری جگہ پر یوں لکھا گیا ہے:

> "Cultural relativism refers to not judging a culture to our own standards of what is right or wrong, strange or normal. Instead, we should try to understand cultural practices of other groups in its own cultural context."[42]

گمان و درجہ تاثیر کا اظہاریہ زبان کی تشکیل کا ذریعہ ہے، یوں فرد، معاشرہ اور تہذیب جہاں دیگر عناصر کی شناخت بناتے ہیں وہاں زبان کی شناخت بھی بنتی ہے۔ زبان، تہذیب و ثقافت کی نمائندگی، تخلیقی فکر و شعور کی بنیادوں پر قائم کرتی جب کہ تہذیب کی نمائندگی، تمدنی فکر و شعور کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ باہمی تعلق اور جڑت زبان و بیان اور تہذیب و ثقافت کی ترویج کا معاملہ ہے جس میں تعطل شناختی بحران کو آوازہ دیتا ہے۔ اردو زبان، یہاں کی مٹی سے جڑی روایات، تمدن، ثقافت، فنون، اقدار اور تخلیقی اظہاریے کی نمائندہ زبان ہے جو تہذیب و ثقافت تشکیلیت اور ترجمانی کا معاملہ بطریقِ احسن نبھاتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں بلاشبہ مذکورہ بحث کا حاصل تطہیرِ فکر، ذوق اور آداب سے مرصع تخلیقی فکری و شعوری اثاثہ؛ معاشرت، ترقی یافتہ اور مودب روایات سے مرقع تہذیبی فکری و شعوری نتیجہ؛ فکری، ثقافتی اور مادی ترقی کی تشکیلیت؛ سماجی و معاشرتی تنظیم کاری کی صفت و بُنت؛ تمدن، مدنیت، شہر زیستی و شہر نشینی؛ اخلاق، ثقافہ، کادیب و انظباط؛ فرد، قوم اور معاشرہ کی ثقافتی شناخت اور اعلیٰ طرزِ زندگی کی تہذیبی شہادت؛ فنونِ لطیفہ میں انفرادیت اور مہارتِ کاملہ؛ ادب میں پہچان اور بصیرتِ مکالمہ؛ حمد و نعت، نظم، غزل، غزم اور مرثیہ؛ داستان، قصہ، ناول، کہانی اور افسانہ کی زیبائی تہذیبی شعور، تخلیقی ادب اور تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل کا حاصل ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء)، ۴۵۔

۲۔ ابراہیم اعظمی، ''فیض احمد فیض کی نظر میں کلچر کیا ہے''، مشمولہ: ادبی میراث:

https://adbimiras.com/faiz-ahmad-faiz-ki-nazar-mein-culture-kia-hai-by-ibrahim-azmi/

۳۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ (دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۵ء)، ۵۔

4. T.S. Eliot, Notes *Towards the Definition of Culture* (Boston: Houghton Mifflin Harcourt, 2014), 17.

5. Charles Gray Shaw, *Trends of Solitude and Culture* (Woodstock: American Book Company, 1931), 76.

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، کلچر کے خدوخال (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)، ۱۵۔

7. Alan Wilson Watts, *The Book: On the Taboo Against Knowing Who You Are* (London: Souvenir Press Limited, 2009), 70.

8. Albert Camus, *Create Dangerously* (New York: New Directions Publishing Group, 2019), 46.

9. Barbara W. Tuchman, *The March of Folly* (New York: Simon & Schuster, 2010), 146.

10. Ralph Waldo Emerson, *Letters and Social Aims* (Alister: Evoke E-Books, 2014), 1727.

۱۱۔ رشید حسن خاں، گذشتہ لکھنو (دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۱ء)، ۱۳۔

12. Gerald Woodruff, *Sample Guard* (Morrisville: Lulu Press, 2018), 34.

13. Raymond Williams, *Marxism and Literature* (Oxford: Oxford University Press, 1977), 133.

۱۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادب، کلچر اور مسائل (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء)، ۱۴۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، سیرۃ الرسولؐ کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت (لاہور: منہاج القرآن پرنٹرز، ۲۰۰۷ء)، ۱۷۔

17. Michael Pacione, *Urban Geography: A Global Perspective* (London: Routledge Publishers, 2013), 129-133.

۱۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، ۱۵۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ڈاکٹر فضل اللہ مکرم، ''اردو افسانہ اور تہذیبی روایتیں''، مشمولہ: تعمیر نیوز۔

https://www.taemeernews.com/2013/12/Urdu-fiction-and-cultural-traditions.html

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ پروفیسر قمر رئیس، تلاش و توازن (دہلی: جمال پریس، ۱۹۶۸ء)، ۹۔

۲۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک، پاکستانی اردو افسانہ: ایک تعارف (اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۱۴ء)، ۲۔

۲۴۔ ڈاکٹر نگار عظیم، منٹو کا سرمایہ فکر وفن (دہلی: بزمِ ہم قلم، ۲۰۰۲ء)، ۶۴۔

۲۵۔ ابواللیث صدیقی، بہ حوالہ: منٹو: نوری نہ ناری، از: ممتاز شیریں (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۲۰۰۴ء)، ۱۲۴۔

۲۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو اور افسانہ نگار (لاہور: الوقار پبلی شرز، ۲۰۰۰ء)، ۱۰۹۔

۲۷۔ ندیم احمد، کلیاتِ غلام عباس (کولکتہ: رہروان ادب، ۲۰۱۶ء)، ۲۱۲۔

۲۸۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء)، ۴۹۔

۲۹۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ: تحقیق و تنقید (ملتان: کتاب نگر، ۱۹۸۸ء)، ۳۶۲۔

۳۰۔ ڈاکٹر فرید حسینی، انتظار حسین کے افسانوں میں علامت نگاری (اردو ریسرچ جرنل، ۲۰۲۰ء)، ۲۵۔

۳۱۔ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خاں، اردو افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء)، ۲۲۱۔

۳۲۔ بانو قدسیہ، بانو قدسیہ کے افسانے، مشمولہ: ریختہ

https://www.rekhta.org/authors/bano-qudsiya/stories?lang=ur

۳۳۔ ڈاکٹر ارشاد شفق، "بانو قدسیہ کا افسانوی اسلوب"، مشمولہ: ادبی میراث، (۲۰۲۰ء)، ۲۔

۳۴۔ خالد سہیل ملک، یخ بستہ دہلیز پر پھیلی کہانیاں (پشاور: اعراف پرنٹرز، ۲۰۱۷ء)، ۱۹۔

۳۵۔ یوسف عزیز زاہد، خوف کے کتبے سے یخ بستہ دہلیز پر (پشاور: اعراف پرنٹرز، ۲۰۱۷ء)، ۱۱۔

۳۶۔ ڈاکٹر زبیر شاہ، یخ بستہ دہلیز (پشاور: اعراف پرنٹرز، ۲۰۱۷ء)، ۶۲۔

۳۷۔ ڈاکٹر سلمیٰ اسلم، "مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی بازیافت"، مشمولہ: خیابان (پشاور: ۱۹۹۳ء)، ۱-۵۔

۳۸۔ رابعہ الرباء، رابعہ الربا کے افسانے، مشمولہ: ریختہ

https://www.rekhta.org/authors/rabia-al-raba/stories?lang=ur

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ ابراہیم اعظمی، "فیض احمد فیض کی نظر میں کلچر کیا ہے"، مشمولہ: ادبی میراث۔

https://adbimiras.com/faiz-ahmad-faiz-ki-nazar-mein-culture-kia-hai-by-ibrahim-azmi/

41. Jacqueline Bhagavan, *Human Rights and Adolescence* (Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 2014), 55.

42. James M. Henslin, *Sociology: Down to Earth Approach* (Hoboken, 2015), XXV.